© rasailojaraid.com

ضیاء دور: جواز واستحکامِ حکومت کی سیاست

لبنیٰ کنول

تعارف

جنرل محمد ضیاء الحق اور اُن کا دور حکومت پاکستان کی تاریخ میں کئی حوالوں سے زیر بحث رہا ہے۔ اُن کی ذاتی زندگی، سیاسی فیصلے اور حکومتی اقدامات سے متعلق شدید اختلافات سیاسی، سفارتی اور علمی حلقوں میں موجود ہیں۔ کچھ لوگ اُنہیں ۱۹۸۰ء کی دہائی کی سب سے زیادہ نمایاں شخصیت قرار دیتے ہیں تو کچھ لوگ اُنہیں روس کے خلاف امریکہ کی کٹھ پتلی کے طور پر شناخت کرتے ہیں۔

اُن کے دور کے نمایاں فیصلے مثلاً مارشل لاء کا نفاذ، بھٹو کیس، مسئلہ افغانستان، اسلامائزیشن، غیر جماعتی انتخابات، آٹھویں ترمیم اور جونیجو حکومت کی برطرفی ہیں۔ اُن کے دور کے خاتمے کے بعد کے تقریباً اٹھارہ سالوں نے اُن کے دور کے تجزیے کو زیادہ آسان بنا دیا ہے۔ اسمبلیوں کے ٹوٹنے اور بننے، سیاسی عدم استحکام، وزرائے اعظم کی برطرفی، جاگیرداروں کی جگہ سرمایہ داروں کا سیاست میں عروج، امریکہ کا واحد سپر پاور کی حیثیت سے کردار، مسلم دنیا کی بے عملی جیسے مسائل نے ضیاء دور کی سیاسی و سفارتی بنیادوں کو واضح کر دیا ہے۔ اِس طرح پیپلز پارٹی اُن کے اقتدار میں آنے کے دِن کو یوم سیاہ کے طور مناتے رہے۔ روئیداد خان ضیاء الحق کی ذاتی صفات کے معترف ہیں[1] تو الطاف گوہر نے اُن کی شخصیت اور اقدامات پر شدید تنقید کی ہے اور اُن کے دور کو بدترین شخصی استبداد سے تعبیر کیا[2] جنرل عارف اور جنرل چشتی جیسے ساتھی بھی اُن پر تنقید کر چکے ہیں[3]۔

ضیاء حکومت کا قیام سیاسی منظر

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء کے نفاذ سے بھٹو حکومت کا تختہ اُلٹ کر اقتدار سنبھالا۔ قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دیں۔ ۱۹۷۳ء کا آئین معطل کر دیا، گورنروں اور وزراء کو عہدوں سے برطرف کر دیا، چاروں صوبوں کے ہائی کورٹوں کے چیف جسٹس صاحبان کو صوبوں کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ چوہدری فضل الٰہی بدستور ملک کے صدر رہے۔ ان کے قومی فرائض کی ادائیگی میں مدد کے لئے ایک چار رکنی فوجی کونسل تشکیل دی گئی۔ مارشل لاء ضوابط واحکامات کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پاکستان جو کہ اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا اسلامی نظام کو ملک کی سلامتی کے لئے لازمی قرار دیا[4]۔

۱۹۷۷ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دور اقتدار کا ایک اہم فیصلہ کیا کہ عام انتخابات کروائے جائیں جبکہ ان انتخابات کو آئین کے تحت مزید ایک سال کے لئے ملتوی کیا جا سکتا تھا۔ بھٹو قبل از وقت انتخابات کے انعقاد کو ملک میں جمہوریت اور اپنی حکومت کی کامیابی کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ بھٹو کو یقین تھا کہ مخالف سیاسی جماعتیں نظریاتی طور پر متحد نہیں لہٰذا وہ کبھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی پیپلز پارٹی کے خلاف کوئی سیاسی اتحاد قائم نہیں کر سکیں گی۔ خفیہ ایجنسیاں بھی بھٹو کو اس امر کی یقین دہانی کر چکی تھیں۔ اس کے علاوہ بھٹو کی یہ بھی خواہش تھی کہ وہ ان عام انتخابات میں دو تہائی اکثریت حاصل کریں تاکہ آئین میں اپنی پسند سے ترمیم کر سکیں[۵]۔

وہ انتخابات میں خود کو کامیاب دیکھنا چاہتے تھے اس مقصد کے لیے انہوں نے منصوبے بھی بنا رکھے تھے۔ ۱۹۷۷ء کے آغاز سے وہ سیاسی ماحول کو اپنے حق میں سازگار سمجھتے تھے اور اپنی مدت پوری کیے بغیر اس وقت سے فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے چنانچہ ۷ مارچ کو قومی اسمبلی اور ۱۰ مارچ ۱۹۷۷ء کو صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کرانے کا اعلان کیا گیا۔

انتخابات کے اعلان کے ساتھ ہی بھٹو مخالف سیاسی جماعتیں متحرک ہو گئیں اور ''پاکستان قومی اتحاد'' کے نام سے نو سیاسی جماعتوں تحریک استقلال، جماعت اسلامی، جمعیت علمائے اسلام، پاکستان جمہوری اتحاد، خاکسار تحریک، جمعیت علمائے پاکستان، مسلم کانفرنس، نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی، مسلم لیگ (قاسم گروپ) نے حکومت مخالف انتخابی اتحاد قائم کر لیا[۶]۔

یہ جماعتیں سیاسی اعتبار سے مختلف نظریات رکھتی تھیں اور پیپلز پارٹی کی حکومت کو اقتدار سے ہٹانے کے واحد مقصد کے تحت اکٹھی ہوئیں۔ انہیں توقع تھی کہ اس اتحاد سے ۱۹۷۰ء کے انتخابات کی طرح پیپلز پارٹی کے خلاف ان کا ووٹ بنک تقسیم نہیں ہو گا عوام نے بھی اس امید کو مہمیز دی اور قومی اتحاد کی انتخابی مہم اور جلسوں میں بڑی تعداد میں شرکت کی اس سے قومی اتحاد کو انتخابات میں اکثریت سے کامیابی کے واضح امکانات نظر آنے لگے۔ دوسری طرف پیپلز پارٹی کے وہ جلسے جن میں بھٹو شریک نہیں ہوتے تھے ناکام ہو رہے تھے[۷]۔

انتخابات کے نتائج کا اعلان پاکستان قومی اتحاد توقعات کے خلاف تھا پاکستان قومی اتحاد قومی اسمبلی میں صرف ۳۶ نشستیں حاصل کر سکا جبکہ پیپلز پارٹی ۱۵۵ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ قومی اتحاد نے انتخابات کے نتائج ''جھرلو'' قرار دے کر نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ قومی اتحاد نے وزیراعظم اور چاروں صوبوں کے وزراء اعلیٰ کی بلا مقابلہ کامیابی، مخالف امیدواروں کو کاغذات نامزدگی جمع کرنے سے روکنے کے لیے مختلف حربوں کا استعمال اور بیلٹ بکس تبدیل کرنے کے واقعات کے حوالے دیئے اور حکومت کے خلاف ملک گیر تحریک کا آغاز کر دیا۔

قومی اتحاد میں شامل بعض جماعتوں نے نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے نعرے پر الیکشن میں حصہ لیا تھا، انہوں نے یہ نعرہ لگایا کہ بھٹو حکومت نے انتخابات میں دھاندلی نظام مصطفیٰ کے نفاذ کو روکنے کے لیے کی ہے لہٰذا نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے لیے بھٹو حکومت کا خاتمہ ضروری ہے جس کے لیے مذہبی طبقوں کو حکومت کے خلاف تحریک میں حصہ لینا چاہیے۔ قومی اتحاد نے اس تحریک کو نظام مصطفیٰ کے نفاذ کی تحریک قرار دیا جس سے حکومت کے خلاف مذہبی جوش و جذبے سے مظاہرے اور ہڑتالیں شروع ہو گئیں اور سیاسی حالات دن بدن نازک صورت اختیار کرنے لگے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان حالات میں قومی اتحاد اور بھٹو کے درمیان معاملات طے کروانے کے لئے متحدہ عرب امارات، لیبیا، سعودی عرب اور کویت نے خدمات پیش کیں۔ بھٹو نے بھی حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اپوزیشن کے سربراہ مفتی محمود کو بات چیت کی دعوت دی اور آئین پاکستان کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپوزیشن کی تمام شکایات کے قانونی ازالے کی یقین دہانی کرائی لیکن قومی اتحاد انتخابات کے نتائج اور بھٹو حکومت کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ حکومتی رویے میں مزید سختی پیدا ہوگئی اور حکومت نے اپوزیشن اور اس تحریک کو سختی سے کچلنے کا فیصلہ کر کیا۔ جلسے جلوسوں پر پابندی عائد کردی۔ قومی اتحاد کی تحریک کو دبانے کے لئے حکومت کی جانب سے تحریک کے رہنماؤں اور کارکنوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوگیا[۸]۔

لیکن تحریک میں شدت پیدا ہوتی گئی جس نے حکومت کو مذاکرات کے لئے مجبور کردیا۔ حکومت نے مذاکرات کی راہ ہموار کرنے کے لئے گرفتار سیاسی رہنماؤں کو رہا کر کے مذاکرات کے شیڈول کا اعلان کردیا۔ جون میں مذاکرات شروع ہوئے۔ پیپلز پارٹی اور قومی اتحاد کے رہنماؤں کا خیال تھا کہ سیاسی حالات بہتری کی طرف جارہے تھے۔ بالآخر طویل مذاکرات کے بعد انہوں نے سمجھوتے کا ایک مسودہ تیار کرلیا لیکن اس پر بھٹو اور اپوزیشن نے اس لئے فوری دستخط نہ کیے کہ مخالف اُنہیں کمزور نہ سمجھیں[۹]۔

بہر حال بھٹو نے ۵ جولائی کو مسودے پر دستخط کا اعلان کیا لیکن اسی رات چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق کی قیادت میں فوجی دستے حرکت میں آگئے اور ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو ملک میں ''آپریشن فیئر پلے'' کے ذریعے مارشل لاء نافذ کردیا گیا۔ بھٹو، قومی اتحاد اور پیپلز پارٹی کے دیگر رہنماؤں کو مری میں نظر بند کردیا گیا[۱۰]۔

ان حالات میں جب کہ حکومت اور قومی اتحاد کے درمیان تقریباً تقریباً مصالحت ہوچکی تھی۔ احتجاج اور ہنگامے دم توڑ رہے تھے، ملکی صورت حال خطرے سے باہر تھی اور زندگی معمول پر آرہی تھی، پارلیمانی نظام کا خاتمہ اور مارشل لاء کا نفاذ ملک میں جمہوریت اور اداروں کے استحکام کے لئے کوئی مثبت علامت نہ تھی۔

عوام حقیقی جمہوریت کے نفاذ کے خواہاں تھے اور ابتدائی طور پر یہی خواہش مارشل لاء کے نفاذ کے جواز اور مقصد کے طور پر پیش کی گئی۔ قومی انتخابات نوے دن کے اندر اندر اور اقتدار عوام کے منتخب اور حقیقی نمائندوں کے سپرد کرنے کا وعدہ کیا گیا۔

مارشل لاء کے نفاذ سے ۱۹۸۵ء میں نیم جمہوریت کی بحالی تک فوجی حکومت اپنے اقتدار اور جواز میں مصروف نظر آتی ہے۔ ضیاء الحق فوج کے سربراہ کے طور پر مارشل لاء کے ثمرات سے بہرہ مند ہوتے رہے اور اس جواز کے خالق کے طور پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ مارشل لاء کے نفاذ کو ملک کی بقاء اور سالمیت کے لئے ناگزیر قرار دیا گیا اور فوج کو سیاسی عزائم سے بالاتر ادارے کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس یقین دہانی اور نوے دن میں منصفانہ انتخابات کے وعدے کی وجہ سے لوگوں نے اس مارشل لاء کو خوش آمدید کہا اور کہیں بھی اس کے خلاف سوائے پیپلز پارٹی کے چند جیالوں کے کوئی نمایاں احتجاج نہیں ہوا[۱۱]۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کچھ سیاستدانوں جن میں ولی خان اور اصغر خان شامل ہیں اُنہوں نے اس مارشل لاء کا خیر مقدم کیا۔ مولانا ابوالعلیٰ مودودی، نواب زادہ نصر اللہ خان اور قومی اتحاد کے بعض دوسرے رہنماؤں نے بھی اس فوجی حکومت کی کھل کر مخالفت نہ کی اور بھٹو کے مخالف سیاسی رہنماؤں نے جنرل ضیاء سے تعاون کرنا شروع کر دیا۔[۱۲]

۵ جولائی کی شام جنرل ضیاء الحق نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ریڈیو اور ٹی وی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے مارشل لاء کے نفاذ پر عوام کے ردِعمل کو حوصلہ افزا قرار دیا اور اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے سپرد کرنے کی یقین دہانی کرائی جس کے لئے اکتوبر ۱۹۷۷ء میں انتخابات کرانے کا وعدہ کیا۔[۱۳]

فوجی حکومت نے انتظامی امور چلانے کے لئے صدر کا عہدہ قائم رکھا چوہدری فضل الٰہی بدستور ملک کے صدر رہے لیکن ضیاء الحق نے صدر کے قومی فرائض میں اور فوج کو اقتدار میں شریک کرنے کے لئے ایک چار رکنی فوجی کونسل تشکیل دی۔[۱۴]

ضیاء نے سیاسی نظام کو کنٹرول کرنے، اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے، اختیارات میں اضافے اور اپنی حکومت کو طول دینے کے لئے مختلف جواز ڈھونڈے اور اس کے لئے حکمت عملی تشکیل دی۔

اگست ۱۹۷۸ء میں چوہدری فضل الٰہی کے عہدہ صدارت کے خاتمے نے ضیاء کو اپنے دائرہ اثر بڑھانے کا موقع فراہم کیا۔ انہوں نے پاکستان کے صدر کا عہدہ بھی سنبھال لیا اور اس طرح وہ بیک وقت چیف آف آرمی سٹاف، مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر مملکت کے منصب پر فائز ہو گئے، انہوں نے اس عہدے پر فائز ہونے کو ایک عارضی اقدام قرار دیا اور کسی مناسب متبادل کی تقرری پر اس عہدہ سے علیحدگی کا وعدہ کیا مگر وہ تادم حیات اس عہدے پر فائز رہے۔[۱۵]

مارشل لاء کے ابتدائی اقدامات کے بعد ضیاء نے اپنی توجہ ان معاملات کی طرف مرکوز کی جو ان کے لئے چیلنج بن سکتے تھے۔

۱۹۷۳ء کے آئین کی دفعہ ۶ کے تحت آئین منسوخ کرنے والے کے خلاف غداری کا مقدمہ چلایا جا سکتا تھا اور اس کی سخت سزا تھی اس کی بنیاد پر بیگم نصرت بھٹو نے ۲۰ ستمبر ۱۹۷۷ء کو سپریم کورٹ میں مارشل لاء کے نفاذ، وزیر اعظم بھٹو اور ان کے دس دیگر ساتھیوں کی نظر بندی کو چیلنج کیا جن کو چیف جسٹس یعقوب علی خان نے سماعت کے لئے منظور کر لیا۔ اس خطرے سے نپٹنے کے لئے اور اپنے اقتدار کو آئینی جواز فراہم کرنے کے لئے ضیاء الحق نے عدالتی نظام میں تبدیلی کا فیصلہ کیا جس کے تحت اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان کو مارشل لاء حکومت کی اطاعت کا حلف اُٹھانے کا حکم صادر کیا گیا۔ چیف جسٹس یعقوب علی خان نے یہ حلف اُٹھانے سے انکار کر دیا۔ اُن کی جگہ اپنے حمایتی جسٹس انوار الحق کا تقرر کیا۔ جنہوں نے ضیاء کے حسب منشاء ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کو ''نظریہ ضرورت'' کے تحت جائز قرار دیا۔

سپریم کورٹ نے ضیاء کے دائرہ اختیار کو بڑھا دیا۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو مارشل لاء آرڈر جاری کرنے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ریگولیشن جاری کرنے کا اختیار مل گیا۔ آئین کے تحت چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تمام اختیارات کا مالک بن گیا۔ یہاں تک کہ آئین میں ترمیم بھی کر سکتا تھا۔ فیصلے میں یہ بھی کہا گیا کہ ۱۹۷۳ء کا آئین منسوخ نہیں کیا گیا بلکہ اس کے کچھ حصوں پر عمل درآمد روک دیا گیا ہے۔ اس فیصلے سے ضیاء تین فوائد حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ ایک تو ضیاء حکومت کو آئینی تحفظ مل گیا۔ دوسرے ضیاء جب تک چاہتے انتخابات موخر رکھ سکتے تھے۔ تیسرے اپنی پسند سے ضیاء آئینی اور قانونی ڈھانچہ تشکیل دے سکتے تھے۔[16]

سپریم کورٹ کے اس فیصلے نے نیا سیاسی منظر تشکیل دینے کی طرف رہنمائی کی مارشل لاء کے نفاذ سے ہی کچھ سیاسی جماعتیں انتخابات کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ اس فیصلے کے بعد کچھ سیاسی جماعتیں انتخابات سے قبل مارشل لاء کے تحت احتساب کی حامی بن گئیں۔ احتساب کا مطالبہ ضیاء کے لئے بڑا پرکشش تھا جس کی آڑ میں وہ اپنے سیاسی مخالفین کو زیر کر کے اپنے اقتدار کو مستحکم کر سکتے تھے اور اپنے دشمنوں کو سیاسی منظر سے ہٹا سکتے تھے۔ احتساب کے عمل کو وسیع اور سخت کرنے کے لئے جنرل ضیاء نے گیارہ خصوصی ٹریبونل قائم کئے۔

جنرل ضیاء کے احتساب کا عمل بھٹو اور پیپلز پارٹی کے دیگر سرکردہ لیڈروں سے شروع ہوا۔ بھٹو کے خلاف مقدمات کی ایک طویل فہرست تیار کی گئی مگر ان میں سے اہم مقدمہ نواب محمد احمد خان قصوری کے قتل کا تھا۔ یہ قتل ۱۰ نومبر ۱۹۷۴ء کو لاہور میں ہوا۔ ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کو احمد رضا قصوری نے ایف۔ آئی۔ آر درج کروائی جس میں انہوں نے شبہ میں بھٹو کا نام درج کروایا۔ احمد رضا قصوری نے بھٹو پر الزام لگایا کہ وہ احمد رضا قصوری کو قتل کرنا چاہتے تھے ان کی جگہ ان کے والد نواب محمد احمد خان قتل ہو گئے۔ احمد رضا قصوری نیشنل اسمبلی کے رکن تھے اور ان کے بھٹو کے ساتھ شدید سیاسی اختلافات تھے لیکن بھٹو دور میں یہ تحقیقات ایسی کسی شہادت اور ثبوت تک نہ پہنچ سکیں جن کے ذریعے قاتلوں کا کوئی سراغ مل سکتا۔ اس انکوائری کی حدود میں فیڈرل سیکورٹی فورس کو شامل نہیں کیا گیا تھا چنانچہ اس کیس کی فائل یہیں بند کر دی گئی۔[17]

ضیاء دور میں احتساب کے عمل کے تحت جب اس کیس کی دوبارہ انکوائری شروع کرائی گئی تو فیڈرل سیکورٹی فورس جس پر بھٹو کی ذاتی فورس ہونے کا الزام لگایا جاتا تھا اس کے ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود کو اس انکوائری میں شامل کیا گیا جنہوں نے اعتراف کیا کہ وہ محمد احمد خان کے قتل کی سازش میں شریک تھے۔ بعد ازاں مسعود محمود اور ایف ایس ایف کے کئی اور عہدے داران نے سرکاری گواہوں کی استغاثہ کی الزامات کی تصدیق کی۔ لہٰذا ان تحقیقات کے نتیجے میں ذوالفقار علی بھٹو کو ۳ ستمبر ۱۹۷۷ء کو ان کی رہائش گاہ سے گرفتار کر کے لاہور بھجوا دیا گیا۔[18]

لاہور ہائی کورٹ نے بھٹو کو نواب محمد احمد خان کے قتل کے مقدمہ میں سزائے موت کا فیصلہ دیا۔ سپریم کورٹ نے بھی نظرثانی کی درخواست نامنظور کر دی۔ رحم کی اپیلیں جو کہ بھٹو اور ان کے ساتھیوں کی جانب سے کی گئی تھیں مسترد کر دی گئیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسی کئی اپیلیں بیرون ملک سے بھی موصول ہوئیں مگر ضیاء نے ان پر توجہ نہ دی۔ ۱۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو بھٹو کو راولپنڈی میں پھانسی دے دی گئی[۱۹]۔

ضیاء نے پہلے دو سال بھٹو کو سیاسی منظر سے ہٹانے کے لئے کوششوں میں گزارے۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد ضیاء الحق مطمئن ہو گئے اب ضیاء کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد ان کی حکومت کو سیاسی استحکام حاصل ہوا[۲۰]۔ وہ یہ تاثر دینے میں کامیاب رہے کہ وہ بہت مضبوط اعصاب کے مالک ہیں اور کسی دباؤ میں نہیں آتے۔ نیز ان سے متعلق بھٹو مخالف لابی میں قانون کے صحیح رکھوالے کا نظریہ گردش کرنے لگا جس سے انہیں دوہرے فوائد حاصل ہوئے۔

ضیاء اور اسلامائزیشن

۱۹۷۷ء میں بھٹو کے خلاف چلنے والی ''تحریک نفاذِ نظام مصطفیٰ'' کو عوامی مقبولیت حاصل تھی جس کو مدنظر رکھتے ہوئے بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد ضیاء نے عوامی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے اس نعرے کو اپنا لیا اور ملک کے سیاسی، سماجی اور انتظامی ڈھانچے کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کا اعلان کیا بعد ازاں اپنے اقدامات کے ذریعے اسی بنیاد پر عوام سے مسلسل حمایت کے لئے کوشاں رہے[۲۱]۔

اپنی حکومت کے اخلاقی جواز کے لئے ضیاء الحق نے اسلام کی سیاسی تشریحات کا سلسلہ شروع کیا اور ایک معتبر مذہبی طبقے کو ساتھ ملا کر جمہوریت، اسلام اور اقتدار کی نئی وضاحتیں دیں انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ:

> ''مسلمان خصوصاً پاکستان کے مسلمان ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب اور ایک حکمران کے ماننے والے ہیں۔ اسلام میں اس بات کی اہمیت نہیں کہ کسی نے اقتدار کیسے حاصل کیا۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ حکمران ایمان رکھتا ہو عملاً مسلمان ہو اگر وہ اس معیار پر پورا اترتا ہے تو لوگ اس کی اطاعت کرتے ہیں ورنہ اسے نکال دیتے ہیں''۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضیاء کے نزدیک اقتدار کے حصول کا طریقہ کار کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ وہ اپنی حکومت کے مقاصد کو ایک مخصوص انداز میں پیش کر کے اپنے اقتدار میں رہنے کا جواز ڈھونڈ رہے تھے اور اس کے لئے اسلامی نظام کے نفاذ کا نام لے کر ہی اسے عوام سے جائز قرار دلوا سکتے تھے[۲۲]۔

جنرل ضیاء اپنے بیانات کے ذریعے عوام کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ وہ اقتدار میں صرف ایک مقصد کے لئے آئے ہیں اور وہ ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ ہے۔ جنرل ضیاء اکثر و بیشتر اپنی تقاریر میں کہتے کہ پاکستان اسلام کی بنیادوں سے دور ہو گیا ہے، پاکستان کی مشکلات کا اصل سبب سیاسی اور معاشی اداروں پر طویل عرصے تک برطانوی تسلط تھا جس نے قانونی نظام کو سب سے زیادہ متاثر کیا مغربی قوانین اور اسلامی قوانین میں بہت فرق ہے۔ اسلامی قوانین قرآن و سنت پر منحصر ہیں جن کی بنیاد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روحانیت پر ہے۔اسلامی معاشرے کی تشکیل اسلامی قوانین کے رائج ہونے سے ہی ہوسکتی ہے [۲۳]۔

ملکی قوانین کو اسلامی قوانین سے ہم آہنگ کرنے کے لئے بھٹو حکومت نے بھی کئی اقدامات کیے تھے۔مثلاً ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت اسلامی نظریاتی کونسل تشکیل دی گئی لیکن اس کونسل کے اختیارات محدود تھے اور اس کونسل نے جو بھی سفارشات مرتب کیں ان پر عمل درآمد نہ ہوسکا جنرل ضیاء نے کونسل کو با اختیار بنانے کے لئے کونسل کی تشکیل نو کی اور اس کے اراکین کی تعداد بڑھا کر بیس کر دی [۲۴]۔

جنرل ضیاء نے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے قانون، ثقافت، تعلیم اور معیشت کی طرف توجہ مبذول کی۔ ۱۰ فروری ۱۹۷۹ء کو جنرل ضیاء نے ایک صدارتی حکم جاری کیا جس کے تحت ملک میں شریعت بینچ قائم کیے گئے۔اس حکم نامے کے تحت عدالت عالیہ کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ پاکستان کے کسی شہری، مرکزی یا صوبائی حکومت کی درخواست پر کسی بھی ملکی قانون اور حکومتی اقدام کو جو قرآن وسنت کے منافی ہو کالعدم قرار دے سکتی ہے [۲۵]۔

کونسل کے فرائض میں شامل تھا کہ ملک میں رائج قوانین کا جائزہ لے کر انہیں قرآن وسنت کے مطابق بنانے کے لئے سفارشات مرتب کرے۔کونسل نے جو سفارشات پیش کیں ان میں نماز کا خصوصی وقفہ، حدود کا اجراء، بلا سود بینکاری، زکوٰۃ کا نظام، رشوت خوری کا انسداد، قصاص، ودیت، قانون شہادت اور قانون شفعہ جیسی اہم سفارشات شامل تھیں۔کونسل نے مجموعی طور پر ۲۳۵ قوانین کا جائزہ لے کر ۸۰ قوانین میں ترامیم کرنے کی سفارش کی اور ۶۶ قوانین کو غور کے لئے وفاقی شرعی عدالت کے سپرد کر دیا [۲۶]۔عوام اور حکومت کے درمیان رابطے کے لئے ایک وفاقی مجلس شوریٰ نامزد کی گئی اس مجلس شوریٰ کو نئی اسمبلی کے قیام تک برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔اس مجلس شوریٰ کی نامزدگی کا اختیار جنرل ضیاء کو حاصل تھا جنہوں نے ایسے اراکین کو نامزد کیا جن کی انہیں مکمل حمایت حاصل تھی۔اس مجلس شوریٰ کا بنیادی مقصد حکومت کو مشورہ دینا تھا اور ایک حد تک عوامی ادارے کے طور پر کام کرنا تھا۔اس مجلس شوریٰ کو قانون سازی کے اختیارات دیئے گئے تھے لیکن اس کو کابینہ کی مرضی کا پابند بنا کر اصل اختیارات حکومت نے اپنے پاس رکھے مجلس شوریٰ درحقیقت حکومت کا ایک ایسا قدم تھا جس کا مقصد عوام کو یہ تاثر دینا تھا کہ ملک میں پارلیمانی نظام کے نفاذ کے لئے کام کی ابتداء ہو چکی ہے حقیقتاً مجلس شوریٰ بے اختیار تھی حتمی اختیارات صدر کے پاس تھے [۲۷]۔

جنرل ضیاء نے ملک کو اسلامی نظام کے مطابق ڈھالنے کے لئے جو اقدامات کیے اس کے دوررس نتائج سامنے نہیں آئے۔حدود آرڈیننس کے اجراء کے وقت عمومی خیال یہ تھا کہ اس آرڈیننس کے نفاذ سے جرائم میں کمی واقع ہوی مگر یہ اقدام اثرات کے حوالے سے ابھی تک متنازعہ ہے۔مجرموں کو کوڑے مارنے کی سزائیں عملاً دیکھنے میں آئیں لیکن اس آرڈیننس کے نفاذ کے نتیجہ میں اندرون ملک مختلف فرقوں میں اختلافات پیدا ہو گئے اور سخت سزاؤں کی وجہ سے بیرون ملک پاکستان کی ساکھ بھی متاثر ہوئی۔ان اقدامات سے جرائم کی شرح کم نہیں ہوئی البتہ جب یہ سزائیں نافذ کی گئیں اس وقت بہت کم عرصہ کے لئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جرائم کی شرح میں کمی آئی اسلامائزیشن کے عمل کا فائدہ ضیاء کو ضرور حاصل ہوا ایک تو انہوں نے عوام کو اسلامی نعروں اور اقدامات سے خوش اور مصروف رکھا اور دوسرے اسلام کو ڈھال بناتے ہوئے طویل عرصے تک اقتدار پر قابض رہنے میں کامیاب رہے۔[۲۸]

ضیاء نے ملک اسلامی نظام کے نفاذ کے وعدے اور کچھ ابتدائی اقدامات سے صرف پاکستان کی لوئر اور مڈل کلاس میں مقبولیت حاصل کی۔ جماعت اسلامی اور دوسرے مذہبی گروہوں کی حمایت حاصل کرنے میں بھی کامیاب رہے۔ بھٹو کو سیاسی منظر سے ہٹانے کے بعد سیاسی اور عوامی ردعمل سے بچنے کے لئے انہوں نے پاکستان قومی اتحاد کے کچھ اراکین کو حکومت میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا مگر جلد ہی ان سے چھٹکارا بھی حاصل کرلیا۔ ضیاء ملک میں غیر جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کرانے کے حق میں تھے ان کا کہنا تھا کہ اسلام میں سیاسی جماعتوں کا کوئی تصور نہیں اس لئے انتخابات سیاسی جماعتوں کے بغیر کرائے جاسکتے ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں انہوں نے بلدیاتی انتخابات بھی غیر جماعتی بنیادوں پر کرائے اور انتخابات کے نتائج سے ضیاء کو یہ اندازہ ہوگیا کہ عام انتخابات کی صورت میں وہ اقتدار میں نہیں رہ سکیں گے اس لئے وہ عام انتخابات کے انعقاد سے حتی الامکان گریز کرتے رہے۔[۲۹]

افغان پالیسی

۱۹۷۹ء میں بین الاقوامی حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا جس سے ضیاء نے بہت سے سیاسی فوائد حاصل کیے اور ان کے اقتدار کو استحکام ملا ان میں قابل ذکر افغان مسئلہ ہے جس کی بدولت ضیاء کو مغربی اور اسلامی ممالک کی حمایت کے ساتھ ساتھ غیر جانبدارانہ تحریک کی حمایت حاصل ہوئی۔ نیز بھاری فوجی اور اقتصادی امداد بھی حاصل ہوئی۔ پاکستان کی معیشت کا انحصار غیر ملکی امداد پر ہے، بڑے پیمانے پر بیرونی امداد کے آنے سے ملکی معیشت پر مثبت اثرات مرتب ہوئے اور ملک میں معاشی خوشحالی آئی۔ ضیاء نے افغان جنگ کو جہاد کا نام دیا اور کہا کہ یہ آخری فتح تک جاری رہے گا۔ اپنی افغان پالیسی میں تبدیلی یا ردوبدل کے معاملے میں انہوں نے کسی قسم کا اندرونی یا بیرونی دباؤ قبول نہیں کیا۔ ضیاء کی افغان پالیسی کے اثرات آج بھی پاکستان کو متاثر کر رہے ہیں۔[۳۰]

جنرل ضیاء نے افغانستان میں روسی مداخلت کو کھلی جارحیت قرار دیا اور اسلام کے نام پر افغان مجاہدین کی فوجی اور معاشی امداد مہیا کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ ضیاء کا خیال تھا کہ اگر افغانستان میں گوریلا جنگ کے ذریعے روسی افواج کے لئے مسائل پیدا نہ کئے گئے تو روس مزید آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا ضیاء کی افغان پالیسی امریکی خواہش کا بھی ایک حصہ معلوم ہوتی ہے جس کے تحت امریکہ افغانستان میں روسی وسائل کو ضائع کرنا چاہتا تھا تاکہ ویت نام کی شکست کا بدلہ لے سکے۔[۳۱]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضیاء کی افغان پالیسی کے جماعت اسلامی اور جمعیت علماء پاکستان کے ساتھ ساتھ فوج کے اعلیٰ افسران بھی حامی تھے۔ ضیاء کی حکومت افغان مجاہدین کی فوجی امداد کرتی رہی مگر خارجی سطح پر ضیاء نے یہ موقف اختیار کیا کہ ''ہم کسی ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرتے اور نہ ہی پاکستان کے اتنے وسائل ہیں کہ افغان مجاہدین کی امداد کر سکے اور نہ ہی پاکستان روس جیسی سپر پاور کے خلاف جنگ کا سوچ سکتا ہے[۳۲]۔

افغانستان میں روسی مداخلت نے پاکستان میں جمہوری عمل کو شدید نقصان پہنچایا۔ عوام کی توجہ ملکی سلامتی اور دفاع کی طرف مرکوز ہوگئی جس کا فوجی حکومت نے فائدہ اُٹھایا اور افغان مسئلہ کو بہانہ بنا کر پاکستانی سیاست میں فوج کے قدم نہایت مضبوط کر دیئے۔ افغان جنگ کی وجہ سے مہاجرین کی کثیر تعداد پاکستان میں داخل ہوگئی۔ ان کی آمد سے سماجی، معاشی اور دفاعی مسائل پیدا ہوئے۔ ملک میں منشیات کی فروخت کو فروغ ملا اور پاکستان امریکہ کو ہیروئن بھیجنے والا سب سے بڑا ملک بن گیا۔ اس عرصہ میں کلاشنکوف کلچر نے جنم لیا۔ امریکی امداد روس اور پاکستان کے درمیان تعلقات میں مزید تلخی کا باعث بنی[۳۳]۔

مسئلہ افغانستان کے حل کے لئے مذاکرات کا باقاعدہ سلسلہ جون ۱۹۸۲ء سے شروع ہوا جو وقفہ وقفہ سے ۱۹۸۸ء تک جاری رہا۔ ۱۵ اپریل ۱۹۸۸ء کو جنیوا میں افغانستان اور پاکستان نے ایک معاہدے پر دستخط کئے جبکہ امریکہ اور روس نے ضامن ریاستوں کے طور پر بین الاقوامی ضمانتوں کے اعلان پر دستخط کیے۔ معاہدہ کے مطابق ۱۵ فروری ۱۹۸۹ء تک روسی افواج افغانستان سے چلی گئی تھیں[۳۴]۔

تحریک بحالی جمہوریت

جنرل ضیاء نے ۲۳ فروری ۱۹۷۹ء کو بلوچستان کے سرداروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''اللہ نے ہمیں سیاست کو پاک کرنے کا موقع عطا کیا ہے۔ جب تک معاشرے کو صحت مند بنیادوں پر استوار نہیں کر دیا جاتا انتخابات کروانا فائدہ مند نہیں ہوگا۔ انہوں نے مزید کہا کہ مثبت نتائج کے یقین ہو جانے کے بعد انتخابات کروائے جائیں گے''[۳۵]۔

جنرل ضیاء نے تمام سیاسی جماعتوں کے سامنے ملک میں ایک قومی حکومت کے قیام کی تجویز پیش کی جس میں تمام سیاسی جماعتوں کو نمائندے نامزد کرنے کی پیشکش کی جسے سیاسی جماعتوں نے مسترد کر دیا۔ بعد میں وفاقی کابینہ کے قیام کے اعلان کے ساتھ ہی محدود سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دی گئی[۳۶]۔

حکومت نے عام انتخاب سے پہلے بلدیاتی انتخابات کروانے کا فیصلہ کیا ۲۵ ستمبر ۱۹۷۹ء کو فوجی حکومت نے غیر جماعتی بنیادوں پر بلدیاتی انتخابات منعقد کروائے۔ انتخابات میں کامیاب ہونے والے امیدواروں کی اکثریت پیپلز پارٹی کی حامی تھی ان نتائج نے ضیاء پر واضح کر دیا کہ اگر عام انتخابات کروائے گئے تو ضیاء کا اقتدار میں رہنا ناممکن ہوگا[۳۷]۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضیاء کبھی احتساب کے نام پر کبھی ملک میں امن وامان کی صورتحال کی وجہ سے کبھی سیاسی جماعتوں کے رویے کی وجہ سے انتخابات ملتوی کرتے رہے۔ جنرل ضیاء کی انتخابات سے مسلسل گریز کی پالیسی اور سیاسی جماعتوں پر عائد سخت پابندیوں کی وجہ سے سیاست دان اس حقیقت کو جان گئے تھے کہ ضیاء کبھی بھی عام انتخابات نہیں کروائیں گے اور انتخابات کو ٹالنے کے لئے مختلف حیلے بہانے تراشتے رہیں گے۔ اس لئے سیاسی پارٹیوں نے مل کر مارشل لاء حکومت کے خلاف مشترکہ حکمت عملی اختیار کرنے پر زور دیا۔ جنوری ۱۹۸۱ء کو ایک اتحاد تحریک بحالی جمہوریت (Movement for the Restoration of Democracy) بنایا گیا۔ اس سیاسی اتحاد میں پیپلز پارٹی، تحریک استقلال، پاکستانی ڈیموکریٹک پارٹی، پاکستان مزدور کسان پارٹی، قومی محاذ آزادی، جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ)، آزاد جموں وکشمیر کانفرنس، نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی اور مسلم لیگ (خواجہ خیرالدین گروپ) شامل تھیں[۳۸]۔

ایم آر ڈی عوام میں مقبولیت حاصل کر رہی تھی اس عوامی مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ عوام جمہوریت چاہتے تھے وہ مارشل لاء کی سخت پابندیوں سے تنگ آ چکے تھے۔ ایم آر ڈی نے فروری ۱۹۸۱ء میں ایک مشترکہ مطالبہ کیا کہ ملک سے مارشل لاء کا خاتمہ کیا جائے۔ انتخابات ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت ہوں اور اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کی سپرد کیا جائے۔ ایم آر ڈی میں شامل جماعتیں مختلف نظریات کی حامل تھیں، پیپلز پارٹی ان میں قومی سطح کی جماعت تھی جبکہ باقی جماعتیں چھوٹی اور علاقائی سطح کی تھیں۔ ایم آر ڈی میں شامل جماعتیں صرف ایک مشترکہ مقصد کے لئے سیاسی پلیٹ فارم پر جمع ہوئیں تھیں اور وہ مقصد مارشل لاء حکومت کا خاتمہ تھا[۳۹]۔

۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۳ء تک عرصہ ایسا ہے جس میں ضیاء حکومت کو استحکام حاصل ہوا۔ ایم آر ڈی کی تحریک نے ابھی پوری طرح قدم بھی نہیں جمائے تھے کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے باعث ایم آر ڈی کی عوام میں مقبولیت میں کمی ہوئی اور ضیاء حکومت کو استحکام حاصل ہوا۔ ۲ مارچ ۱۹۸۱ء میں پی آئی اے کے کراچی سے پشاور جانے والے طیارے کو اغوا کر کے کابل پہنچا دیا گیا۔ صدر ضیاء نے کہا کہ یہ کام ''الذوالفقار'' کا ہے۔ جس کے سربراہ وزیر اعظم بھٹو کے صاحبزادے مرتضٰی بھٹو ہیں۔ ضیا حکومت نے طیارے کے اغوا میں مسافروں کی جانیں ضائع ہونے کے واقعہ کو پیپلز پارٹی کو بدنام کرنے کے لئے استعمال کیا اس کو ایک دہشت گرد تنظیم ثابت کرنے کی کوشش کی۔ عوام میں پیپلز پارٹی کا Image خراب ہوا اور اس کی مقبولیت متاثر ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد ایم۔ آر ڈی کی تحریک کچھ عرصہ کے لئے پس منظر میں چلی گئی۔ ۱۹۸۳ء میں ایم۔ آر ڈی کی تحریک دوبارہ منظر عام پر آئی اس مرتبہ تحریک ۱۹۸۱ء کی نسبت زیادہ مؤثر تھی اور ضیاء حکومت کے لئے خطرہ تھی۔ ایم آر ڈی کو کنٹرول کرنے کے لئے ضیاء نے سختی کی پالیسی اپنائی۔ ہزاروں سیاسی کارکن گرفتار کر لئے گئے ان کو سر عام کوڑوں کی سزائیں دی گئیں تاکہ دوسرے ان سزاؤں کے خوف سے تحریک میں شامل نہ ہوں اور حکومت کے خلاف مظاہرے نہ کریں، نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو بھی گرفتار کر لیا گیا[۴۰]۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ تحریک ضیاء حکومت سے اپنے مطالبات منوا سکتی تھی لیکن یہ تحریک تنظیمی اور نظریاتی خطوط پر استوار نہیں کی گئی تھی جس کی وجہ تحریک میں شامل رہنماؤں کے اختلافات تھے۔ یہ تحریک کوئی ایسی سیاسی پالیسی وضع نہیں کر سکی جس پر تمام جماعتیں متفق ہوتیں اور اس پالیسی کے تحت منصوبے پر عمل کرتیں۔ ایم آر ڈی قومی تحریک کی صورت اختیار نہ کر سکی اور علاقائی تحریک بن کر رہ گئی۔ صوبہ سندھ کے اندرونی شہروں میں یہ تحریک بڑی کامیاب رہی جبکہ پنجاب میں زیادہ مقبولیت حاصل نہ کر سکی۔ فوج کا اس صوبے پر موثر کنٹرول تھا اس لئے جتنی پذیرائی اس تحریک کو سندھ کے عوام سے ملی اس کا مظاہرہ پنجاب میں نہیں کیا گیا۔ اس طرح سرحد اور بلوچستان اس تحریک سے قطعی متاثر نہیں ہوئے چنانچہ تحریک وہ نتائج حاصل نہ کر سکی جو وہ قومی سطح کی تحریک ہونے کی بدولت حاصل کر سکتی تھی۔

ایم آر ڈی کا اندرونی انتشار بڑھتا جا رہا تھا ان کے نظریات میں یکسانیت نہیں تھی۔ ایم آر ڈی کی جانب سے مئی کے مہینے میں ۱۴ اگست کے راست اقدام کے فیصلے کے اعلان نے حکومت کو موقع فراہم کر دیا کہ وہ اس تحریک کو ناکام بنانے کے لئے انتظامات مکمل کر لیں۔ ایم آر ڈی کے کارکنوں کو عمر قید کی سزائیں بھی دی گئیں جس کا مقصد عوام میں خوف و ہراس پھیلانا تھا۔ ضیاء کی اس پالیسی کی وجہ سے تحریک کسی حد تک ناکام ہو چکی تھی سخت سزاؤں کی وجہ سے عوام اس میں شمولیت سے اجتناب کر رہے تھے۔ ایم آر ڈی کی ناکامی کے بعد جنرل ضیاء کافی پُر اعتماد ہو گئے کیونکہ انہوں نے جمہوریت کا نام لینے والوں کے حوصلے ایک بار پھر پست کر دیئے تھے، لیکن اس سب کے باوجود نہیں کہا جا سکتا کہ اس تحریک نے ضیاء حکومت کو متاثر نہیں کیا۔ ایم آر ڈی کی وجہ سے مارشل لاء حکومت کو اپنے اقتدار میں رہنے کے لئے قانونی جواز کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس مقصد کے لئے ریفرنڈم کرایا۔ یہ ایم آر ڈی کا دباؤ ہی تھا کہ حکومت نے ۱۲ اگست ۱۹۸۳ء کو ایک سیاسی فارمولے کا اعلان کیا جس کے تحت ۱۹۸۵ء میں انتخابات ہوئے اور ۳۱ دسمبر ۱۹۸۵ء کو مارشل لاء اٹھا دیا گیا[۴۱]۔

ضیاء اور ریفرنڈم

جنرل ضیاء الحق چاہتے تھے کہ خود کو منتخب اور آئینی صدر کی حیثیت دلوا دیں کیونکہ وہ ایک منتخب صدر نہیں تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ۱۹ دسمبر ۱۹۸۴ء کو پاکستان میں ایک ریفرنڈم کرانے کا فیصلہ کیا۔ جس میں پوچھا گیا "کیا آپ صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کے اس عمل کی تائید کرتے ہیں جو انہوں نے پاکستان کے قوانین کو قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ کے مطابق اسلامی احکامات سے ہم آہنگ کرنے اور نظریہ پاکستان کے تحفظ کے لئے شروع کیا ہے"۔ اس سوال کے جواب عوام کے "ہاں" کا مقصد جنرل ضیاء کو آئندہ پانچ سال کے لئے صدر منتخب کرنا تھا۔ جنرل ضیاء نے خود کو صدر منتخب کروانے کے لئے ایسا طریقہ تلاش کیا اور عوام سے ریفرنڈم میں ایسا سوال پوچھا کہ کوئی بھی مسلمان شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ملک میں اسلامی نظام کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نفاذ نہیں چاہتا[۴۲]۔حکومت نے اس ریفرنڈم کو کامیاب بنانے کے لئے حکومتی مشینری کا بھرپور استعمال کیا۔ریفرنڈم کے بائیکاٹ پراُکسانے والوں کے لئے سخت سزاؤں کا اعلان کیا گیا۔ریفرنڈم کے سرکاری نتائج کے مطابق جنرل ضیاء نے ۹۷.۷۱ فیصد ووٹ حاصل کئے اور آئندہ پانچ سال کے لئے صدر منتخب ہوگئے۔ایم آر ڈی نے ان نتائج کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ان کے لیڈروں کا دعویٰ تھا کہ ۵ فیصد سے بھی کم ووٹرز نے اپنا حق رائے وہی استعمال کیا ہے۔ملک کی صرف دو سیاسی جماعتیں مسلم لیگ (پگاڑا گروپ) اور جماعت اسلامی نے ریفرنڈم اور ان کے سرکاری نتائج کی مکمل حمایت کی[۴۳]۔

جو ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہو اور جس کی ۹۵ فیصد آبادی مسلمان ہو وہاں یہ بات ناممکن ہے کہ لوگوں کی زیادہ تعداد نے ریفرنڈم میں پوچھے گئے سوال سے اختلاف کیا ہو۔دراصل جنرل ضیاء اسلام کی آڑ میں خود کو عوام میں مقبول کرانا چاہتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ جنرل ضیاء نے بیلٹ پیپر پر حکومت کے قیام کو ظاہر کرنے کی بجائے اسلام کا نام استعمال کیا۔اگر وہ براہِ راست اپنے آپ کو صدر منتخب ہونے کے لئے پیش کرتے تو قوی امکان تھا کہ وہ ہار جاتے[۴۴]۔

عام انتخابات اور شراکتِ اقتدار

سیاسی جماعتوں کے مسلسل انتخابات کے مطالبے اور بین الاقوامی دباؤ کے پیش نظر ضیاء نے عام انتخابات کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ریفرنڈم کے ذریعے آئندہ پانچ سال کے لئے اپنے اقتدار کو تحفظ دینے اور سیاسی جماعتوں کی رجسٹریشن کا قانون پاس کروانے کے بعد جنرل ضیاء اپنی سیاسی حیثیت کو محفوظ کر چکے تھے۔اب ان کو عام انتخابات سے کوئی حقیقی خطرہ لاحق نہیں تھا اس لئے انہوں نے فروری ۱۹۸۵ء میں غیر جماعتی بنیادوں پر قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد کروائے[۴۵]۔سیاسی جماعتوں کی جانب سے انتخابات جماعتی بنیادوں پر کرانے کا مطالبہ تھا مگر جنرل ضیاء جماعتی بنیادوں پر انتخابات کروانے کے حق میں نہیں تھے۔ان کا کہنا تھا کہ جماعتی بنیادوں پر چلائی جانے والی انتخابی مہم میں کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔وہ سیاسی جماعتوں کے بالکل اسی طرح خلاف تھے جس طرح ایوب خان سیاسی جماعتوں سے نفرت کرتے تھے۔ان کے نزدیک ملک کا سیاسی نظام سیاسی جماعتوں کی غیر موجودگی میں نہایت کامیابی سے چلایا جاسکتا ہے۔حقیقت میں وہ جمہوریت کے خلاف تھے اور ایسی طرزِ حکومت کے حامی تھے جس میں ان کے پاس کُلی اختیارات ہوں جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے سے یہ ممکن نہیں تھا۔وہ کسی صورت اپنے اقتدار میں جماعتوں کی شرکت کے لئے تیار نہیں تھے[۴۶]۔انتخابی پروگرام کے اعلان کے بعد حکومت نے پورے ملک میں اپنے مخالفین کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔جس کے نتیجے میں سینکڑوں سیاست دان گرفتار ہو گئے جلسے جلوس نکالنے پر پابندی عائد کر دی گئی مظاہرے کرنے والوں کے لئے سخت سزائیں رکھی گئیں۔ذرائع ابلاغ پر حکومت کا مکمل کنٹرول تھا۔سختی کی پالیسی کی بدولت ضیاء حکومت کو کبھی کسی مضبوط اپوزیشن کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ان انتظامات کے بعد ضیاء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انتخابات کے "مثبت نتائج" کے لئے پُر امید تھے[۴۷]۔ ملک بھر میں مقررہ تاریخ پر انتخابات کا انعقاد کیا گیا۔ ایم آر ڈی کے بائیکاٹ کے اعلان کے باوجود لوگوں کی اکثریت نے ووٹ ڈالے۔ ووٹ ڈالنے کی شرح تقریباً ۵۲ فیصد رہی۔ یہ شرح دیہاتوں میں شہروں کی نسبت زیادہ تھی۔ قومی اسمبلی کے لئے ڈالے گئے ووٹوں کی شرح ۵۶.۸۲ فیصد رہی[۴۸]۔

انتخابات کے نتائج جہاں ضیاء کی امیدوں کے خلاف تھے وہاں ایم آر ڈی کے لئے بھی مایوس کن تھے۔ جنرل ضیاء کے ایک وزیر کے علاوہ تمام بڑے شہروں کے میئر اور بہت سے مشیر ہار گئے۔ قومی اسمبلی کی ۳۰ نشستوں کے لئے عوام نے حکومت کے امیدواروں کے خلاف اپنا حق رائے دہی استعمال کیا اور ایسے امیدواروں کو منتخب کیا جو سیاست میں نووارد تھے۔ ضیاء کی نامزد کردہ مجلسِ شوریٰ کے آدھے سے زیادہ ممبران ان انتخابات میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جماعت اسلامی نے قومی اسمبلی کی ۶۳ نشستوں پر انتخاب لڑا جس میں سے صرف ۸ نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی۔ قومی اسمبلی میں ۷۰ ممبران کا تعلق مسلم لیگ سے اور ۴۰ کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھے۔ ان امیدواروں نے پارٹی کے فیصلے کے خلاف انتخابات میں حصہ لیا۔ ان انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی اسمبلی میں جاگیرداروں کا غلبہ برقرار رہا فرق صرف یہ ہوا کہ بڑے جاگیرداروں کی جگہ چھوٹے جاگیرداروں نے لے لی[۴۹]۔

انتخابات کے نتائج کے بعد صدر ضیاء نے بڑی سوچ بچار کے بعد پیر پگاڑا کے مشورے سے سندھ سے تعلق رکھنے والے رکن قومی اسمبلی محمد خان جونیجو کو وزیر اعظم نامزد کیا جنہوں نے ۲۴ گھنٹوں کے اندر قومی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیا۔

آٹھویں ترمیم جنرل ضیاء انتخابات کے بعد ایسا پارلیمانی نظام حکومت رائج کروانا چاہتے تھے جو صدارتی نوعیت کا ہو۔ آٹھ سال تک اقتدار پر مکمل قابض رہنے کے بعد ضیاء کو یہ کسی صورت گوارا نہیں تھا کہ وہ پارلیمانی روایات کے مطابق اختیارات وزیر اعظم کو منتقل کر دیتے۔ انہوں نے صدر کے اختیارات میں غیر معمولی اضافہ کرنے کے لئے ایک نئی راہ نکالی اور ۱۹۷۳ء کے آئین میں بعض ایسی ترامیم تجویز کیں جس کے نتیجے میں آئین کا بنیادی ڈھانچہ پارلیمانی رہا مگر آئین میں کچھ ایسی تبدیلیاں آگئیں کہ وہ پارلیمانی کی بجائے صدارتی طرز حکومت کے زیادہ قریب ہو گیا۔ انہوں نے ۲ مارچ ۱۹۸۵ء کو صدارتی حکم نمبر ۱۴ جاری کیا جس کے مطابق ترمیم شدہ دفعات صدر کے اعلان کے بعد نافذ ہونا تھیں[۵۰]۔

جس وقت جنرل ضیاء نے اقتدار سنبھالا ان کی ترجیح واضح طور پر صدارتی نظام کے لئے تھی۔ انہوں نے اپنی کئی تقاریر میں اس بات کا ذکر کیا کہ وہ صدارتی نظام کے حامی ہیں۔ ۱۲ اگست ۱۹۸۳ء میں مجلس شوریٰ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے پارلیمانی نظام پر گہری تنقید کی اور اس نظام کو ۱۹۷۷ء میں ملک میں ہونے والے بحران کا ذمہ دار ٹھہرایا مگر وہ جانتے تھے کہ پاکستانی عوام ملک میں پارلیمانی نظام کا نفاذ چاہتے ہیں اور اگر انہوں نے صدارتی نظام رائج کرنے کی کوشش کی تو عوام ان کے خلاف ہو جائیں گے۔ لہٰذا انہوں نے ۱۹۷۳ء کے آئین میں ایسی تبدیلیاں تجویز کیں جن کے ذریعے پارلیمانی نظام کی موجودگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں صدر کو اتنے اختیارات حاصل ہو گئے کہ وہ صدارتی نظام نظر آنے لگا[۵۱]۔ جنرل ضیاء نے ۱۹۷۳ء کے آئین میں جو ترامیم کیں وہ آٹھویں ترمیم کے تحت کیں جس کا مقصد صدر ضیاء کے نزدیک صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات میں توازن قائم کرنا تھا۔ آئین میں یہ ترامیم ۳۰ دسمبر ۱۹۸۵ء سے یکم اپریل ۱۹۹۷ء تک نافذ رہیں[۵۲]۔ اس ترمیم نے جنرل ضیاء کے ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۵ء تک کے تمام اقدامات کو قانونی تحفظ فراہم کر دیا۔ جنرل ضیاء نے ان ترامیم کو صدر وزیر اعظم کے درمیان اختیارات میں توازن کا نام دیا لیکن حقیقت اس کے برعکس رہی اس ترمیم کے ذریعے صدر کو مختار کل بنا دیا گیا۔ اب صدر ہی وزیر اعظم کی نامزدگی کرتا اور وزیر اعظم صدر کی خوشنودی تک اپنے عہدے پر جائز رہ سکتا تھا۔ کابینہ کے وزراء کی تقرری بھی صدر کی صوابدید پر عمل میں آتی تھی اگرچہ پارلیمانی نظام حکومت میں صدر آئینی سربراہ ہوتا ہے صدر ضیاء نے آٹھویں ترمیم کے ذریعے انتظامی سربراہ کی سی حیثیت حاصل کر لی[۵۳]۔ صدر ضیاء پر وزیر اعظم، عوام اور سیاسی حلقوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا کہ ملک سے مارشل لاء فوراً اٹھا لیا جائے آٹھویں ترمیمی بل کی منظوری اور پارٹی رجسٹریشن کے قانون کے بعد جنرل ضیاء کو مارشل لاء اٹھانے میں کوئی قباحت نظر نہ آئی کیونکہ وہ اس ترمیم کے ذریعے نہ صرف اپنے پچھلے آٹھ سالہ اقتدار کو آئینی تحفظ فراہم کر چکے تھے بلکہ مستقبل میں ایک بادشاہ گر کی حیثیت سے حکمرانی کا آئینی اختیار بھی حاصل کر چکے تھے۔ ان محفوظ اقدامات کے بعد انہوں نے ۳۰ دسمبر ۱۹۸۵ء کو مارشل لاء کے خاتمے کا اعلان کیا[۵۴]۔

جونیجو کی برطرفی

پارلیمانی نظام کے تحت انتخابات کے باوجود ضیاء الحق سیاسی نظام کو اپنے کنٹرول میں رکھنا چاہتے تھے اور اسی لئے اُنہوں نے نہ صرف جونیجو کو وزیر اعظم نامزد کیا بلکہ آٹھویں ترمیم کے تحت صدر کا ملکی سیاسی نظام میں ایک مضبوط کردار بھی متعین کر دیا۔ اس طرح وہ اپنے اقتدار کو مضبوط اور مستحکم محسوس کرتے تھے۔ وہ وزیر اعظم کو دفاع، خارجہ اور قومی سلامتی کے معاملات میں کوئی حیثیت نہیں دینا چاہتے تھے اور دوسری طرف سیاست و حکومت میں فوج اور بیوروکریسی کو بھی وزیر اعظم کے دائرہ اختیار سے باہر رکھنا چاہتے تھے۔ ضیاء الحق یہ سمجھتے تھے کہ ریفرنڈم کے تحت عوام نے اُنہیں اپنی مرضی سے نظام حکومت ترتیب دینے کا اختیار دیا ہے[۵۵]۔

صدر عام حالات میں حکومتی معاملات میں مداخلت نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن وہ محض آئینی سربراہ بھی نہیں رہنا چاہتے تھے۔ اگرچہ بظاہر وہ ایوب خان کی طرح مکمل اختیارات کا مالک نہیں بننا چاہتے تھے لیکن فضل الٰہی چوہدری کے کردار سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ معاملات میں وہ خاص ذمہ داریاں رکھنا چاہتے تھے اور کچھ میں وزیر اعظم کو اختیارات دینا چاہتے تھے[۵۶]۔ لیکن یہ تقسیم اختیارات کی طاقت اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے جبکہ جونیجو یہ سمجھتے تھے کہ وہ منتخب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وزیراعظم ہیں اور پارلیمانی جمہوری نظام کی مکمل بحالی اور تمام اداروں پر ان کا کنٹرول اس نظام کا تقاضا ہے لہٰذا وہ بطور وزیراعظم اپنا وسیع کردار دیکھتے تھے اور اس کردار کی بھرپور ادائیگی کے خواہش مند تھے ان کا خیال تھا کہ پارلیمانی نظام سیاسی جماعتوں کے بغیر نہیں چل سکتا۔ جنرل ضیاء سیاسی جماعتوں کے حق میں نہیں تھے جبکہ جونیجو ملک میں جمہوریت کی بحالی کے لئے سیاسی جماعتوں کو آزادی دینے کے خواہاں تھے۔ جونیجو نے وزیراعظم کی حیثیت سے ۱۹ جنوری ۱۹۸۶ء کو ''پاکستان مسلم لیگ'' کی رسمی طور پر بنیاد رکھی۔ مسلم لیگ کو سرکاری جماعت کا درجہ دیا گیا جس کی سربراہی جونیجو کے پاس تھی۔ سرکاری پارٹی کا درجہ حاصل کرنے کے بعد ممبران اسمبلی کی کثیر تعداد پاکستان مسلم لیگ سے وابستہ ہوگئی۔ جنرل ضیاء کو جونیجو کا یہ اقدام پسند نہیں آیا اور یہیں سے صدر وزیراعظم کے درمیان اختلافات کا سلسلہ چل نکلا[۵۷]۔

۲۰ جنوری ۱۹۸۶ء کو جونیجو نے اپنی کابینہ دوبارہ تشکیل دی جس میں ایسے وزراء کو کابینہ میں شامل نہیں کیا گیا جو ضیاء الحق کے زیادہ قریب تھے۔ ان میں ڈاکٹر محبوب الحق، میر ظفر اللہ جمالی اور ڈاکٹر محمد اسد اللہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مجیب الرحمٰن جو سیکرٹری اطلاعات تھے ان کو عہدے سے برطرف کر دیا[۵۸]۔

صدر اور وزیراعظم کے تعلقات میں ایک دراڑ اس وقت پڑی جب بےنظیر بھٹو اپریل ۱۹۸۶ء میں وطن واپس آئیں اور حکومت کے خلاف تحریک شروع کی۔ انہوں نے جنرل ضیاء پر بیک وقت صدر اور چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ رکھنے پر اعتراض کیا۔ صدر ضیاء کا خیال تھا کہ بےنظیر جونیجو کی شہ پر ایسا کر رہی ہیں۔ ان کے اس خیال کو اس وقت مزید تقویت پہنچی جب ان تک یہ افواہیں گئیں کہ بےنظیر اور جونیجو ان کے خلاف سیاسی اتحاد قائم کر رہے ہیں[۵۹]۔ مئی ۱۹۸۷ء سے مئی ۱۹۸۸ء کے درمیان ایسے واقعات رونما ہوئے کہ صدر اور وزیراعظم کے درمیان حائل اختلافات کی خلیج وسیع ہوتی گئی۔ پارلیمنٹ میں ترمیمی بجٹ کے موقع پر جونیجو نے اعلان کیا کہ کوئی جنرل ۸۰۰ سی سی سے بڑی گاڑی میں سفر نہیں کرے گا۔ نیز اعلیٰ اور سول افسران سے غیر ضروری مراعات واپس لے لی جائیں گی۔ جونیجو نے فوجی افسران کو سیاست سے دور رکھنے کے لئے مختلف محکموں میں کام کرنے والے فوجی افسران کو واپس فوج میں بھیج دیا۔ جنرل ضیاء جونیجو کے اس اقدام کے خلاف تھے۔ جنرل ضیاء انہی فوجی افسران کے بل بوتے پر خود کو اقتدار میں قائم و دائم دیکھتے تھے اور فوج میں کسی قسم کی تبدیلی کو اپنے لئے نقصان دہ تصور کرتے تھے[۶۰]۔

اس سارے منظر میں صدر اور وزیراعظم کے درمیان ایک بڑا اختلاف افغان پالیسی پر تھا۔ جونیجو اس مسئلے کو جلد از جلد حل کرنے کے خواہاں تھے تاکہ پاکستانی معیشت پر افغان مہاجرین کی آمد سے جو منفی اثرات مرتب ہو رہے تھے وہ ختم ہوں دوسرا مہاجرین پُرامن طریقے سے وطن واپس جائیں جبکہ جنرل ضیاء اس سے مختلف نقطہ نظر رکھتے تھے۔ وہ افغان مہاجرین کی امداد کو ایک مسلمان کے ناطے دوسرے مسلمان پر فرض قرار دیتے۔ وہ اس وقت تک کسی معاہدہ پر دستخط کرنے کے خلاف تھے جب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تک افغانستان میں مکمل امن بحال نہ ہوا اور مجاہدین کو افغانستان میں فتح نصیب نہ ہو جائے۔ وہ اس مسئلے کے فوری حل کے اس لئے بھی خلاف تھے کہ ایسا ہونے کی صورت میں وہ مغربی ممالک کی اس امداد سے محروم ہو جاتے جو وہ علاقائی سلامتی کے نام پر مغربی ممالک سے حاصل کر رہے تھے۔ جونیجو افغان مسئلے کے حل کے لئے معاہدہ جنیوا پر دستخط کرنے کے حامی تھے جبکہ ضیاء اس کے مخالف تھے۔ جونیجو نے ضیاء کی پرواہ نہ کرتے ہوئے معاہدہ جنیوا پر دستخط کر دیئے۔ جونیجو حکومت جنیوا معاہدہ کو ایک تاریخی کارنامہ تصور کرتی تھی۔ جنرل ضیاء جونیجو کے ان اقدامات کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے اور وقت نے یہ ثابت کیا کہ ان کی یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی[۶۱]۔

۱۰ اپریل ۱۹۸۸ء کو اوجڑی کیمپ راولپنڈی میں اچانک آگ لگ گئی۔ اوجڑی کیمپ میں کثیر تعداد میں میزائل بم اور گولے تھے جن کے پھٹنے سے کثیر جانی اور مالی نقصان ہوا۔ سانحہ کی تحقیقات کی رپورٹیں جب وفاقی کابینہ کے سامنے آئیں ان سے نہایت اہم معاملات کے بارے میں انکشافات کا ایک سلسلہ چل نکلا جس میں فوج امریکی تعلقات اور افغان پالیسی جیسے حساس اور خفیہ پہلو عوام کے سامنے افشاں ہونے لگے۔ ضیاء تحقیقاتی رپورٹ کے قومی اسمبلی میں پیش کیے جانے کے مخالف تھے وہ اس سلسلے میں عوام کی رائے حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے اس واقعہ کو خفیہ طور پر ختم کرنا چاہتے تھے[۶۲]۔ جبکہ جونیجو اصل واقعات عوام کے سامنے لانا چاہتے تھے۔ ضیاء اس لئے رپورٹ کو منظر عام پر نہیں لانا چاہتے کیونکہ اس میں سانحہ کا ذمہ دار جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کے چیرمین جنرل اختر عبدالرحمٰن اور آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل حمید گل کو ٹھہرایا گیا۔ یہ جنرل ضیاء کے دست راست تھے ان کے خلاف الزام ضیاء کے خلاف الزام تھا۔ ضیاء فوجی حمایت کے بغیر اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرتے تھے۔ فوج کو اپنا وفادار اور متحد رکھنے کے لئے انہوں نے پچھلے گیارہ سالوں میں غیر معمولی محنت کی اور اس محنت کو وہ رائیگاں ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس سے پہلے کہ وزیر اعظم ان افراد کے خلاف کسی کاروائی کا حکم دیتے جنرل ضیاء وزیر اعظم کے خلاف اقدام کا فیصلہ کر چکے تھے[۶۳]۔

جنرل ضیاء نے آٹھویں ترمیم کے تحت حاصل کیے گئے اختیارات کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو آرٹیکل بی (۲) ۵۸ کے تحت اسمبلی تحلیل کر دی اور وزیر اعظم کو برطرف کر دیا۔ وزیر اعظم کی برطرفی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے جنرل ضیاء نے کہا کہ قومی اسمبلی جن مقاصد کے لئے بنائی گئی تھی وہ مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہی ملک میں امن عامہ کی حالت مخدوش ہو گئی تھی وزیر اعظم کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ملک اقتصادی بحران کا شکار ہو گیا۔ پاکستان کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے لئے نفاذ اسلام کا جو کام شروع کیا گیا وزیر اعظم نے اسے نظر انداز کر دیا۔ تقریر کے آخر میں انہوں نے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا اعادہ کیا ساتھ ہی جمہوری حکومت کے قیام اور پاکستان کے روشن مستقبل کے بارے میں عوام کو امید دلانے لگے[۶۴]۔

جنرل ضیاء نے وزیر اعظم کی برطرفی کی جو وجوہات بتائیں ان کی مثال پہلے بھی موجود تھی۔ رشوت ستانی، بدامنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مارشل لاء دور میں بھی رہی، اسلامی نظام کو جونیجو کے ملک میں نافذ کرنے میں ناکام ہونے کا جہاں تک تعلق تھا جنرل ضیاء اس حقیقت سے پہلو تہی کر گئے کہ وہ ساڑھے آٹھ سال تک اقتدار پر مکمل قابض رہنے کے باوجود اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے تو جونیجو تین سال کے عرصے میں ملک میں اسلامی نظام نافذ کرنے میں کیسے کامیاب ہو سکتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ صدر ضیاء وزیر اعظم جونیجو کو ''کٹھ پتلی'' وزیر اعظم سے زیادہ حیثیت دینا نہیں چاہتے تھے جبکہ وزیر اعظم پارلیمانی نظام کے تحت اپنی حیثیت منوانا چاہتے تھے جب جنرل ضیاء نے یہ دیکھا کہ وزیر اعظم انہیں نظر انداز کر رہے ہیں اور حکومتی معاملات پر ان کی گرفت کمزور ہو رہی ہے اور دونوں کے درمیان اختلافات زیادہ ہو گئے تو اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں جونیجو صدر کے خلاف وہ قدم نہ اُٹھالیں جو ماضی میں جنرل ضیاء نے وزیر اعظم بھٹو کے خلاف اُٹھایا تھا، جونیجو کو عہدے سے برطرف کر دیا[۶۵]۔

ضیاء نے جونیجو کو ان کی کمزور شخصیت کی وجہ سے وزیر اعظم نامزد کیا تا کہ ضیاء ملکی معاملات بغیر کسی دخل اندازی کے چلاتے رہیں۔ ضیاء جونیجو کو ''کٹھ پتلی'' وزیر اعظم سے زیادہ حیثیت دینے کے لئے کسی صورت آمادہ نہیں تھے جبکہ وزیر اعظم جونیجو اپنے آپ کو ایک منتخب وزیر اعظم کی حیثیت سے زیادہ با اختیار تصور کرتے تھے۔ جب صدر ضیاء نے محسوس کیا کہ وزیر اعظم جونیجو انہیں نظر انداز کر رہے ہیں اور اہم فیصلے اپنی مرضی سے کر رہے ہیں تو انہوں نے جونیجو کو وزیر اعظم کے عہدے سے برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۲۳ مئی ۱۹۸۸ء کو جنرل ضیاء نے ایک ڈنر جس میں جونیجو بھی شریک تھے اپنے کچھ قریبی دوستوں سے کہا ''آپ دیکھ رہے ہیں جونیجو میں کتنا تکبر آ گیا ہے ان کی بول چال میں بھٹو کا انداز آ گیا ہے''۔

۲۰ جولائی کو صدر ضیاء نے اعلان کیا کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ۱۶ نومبر ۱۹۸۸ء کو غیر جماعتی بنیادوں پر ہونگے لیکن اس سے پہلے کہ یہ انتخابات منعقد ہوتے صدر ضیاء ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو ایک فضائی حادثے میں خالق حقیقی سے جا ملے ان کی وفات پر ملکی صورتحال اسی غیر یقینی کا شکار تھی جو ان کی اقتدار میں آمد کے وقت تھی۔ جنرل محمد ضیاء الحق کی وفات پر اندرون اور بیرون ملک میں شدید رد عمل کا اظہار کیا گیا۔ اقوام متحدہ جنرل اسمبلی میں ان کے سوگ میں ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ مصر کے صدر حسنی مبارک نے صدر پاکستان کی وفات کو عظیم سانحہ قرار دیا۔ اُردن کے شاہ حسین نے صدر ضیاء الحق کی وفات پر اپنے تین روز کا سوگ منانے کا اعلان کیا، صدر ریگن نے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ بہت اچھے دوست تھے انہوں نے افغانستان کے لئے بہت کچھ کیا۔ بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی اور صدر روینکٹ رامے نے صدر ضیاء الحق کی موت پر رنج و غم کا اظہار کیا۔

اندرون ملک ضیاء کی موت ایک عظیم سانحہ قرار دی گئی انہوں نے اسلامی نظام کے وعدے سے پاکستان میں بے حد مقبولیت حاصل کی تھی اس کا اندازہ ان کی وفات پر ہو گیا۔ ان کی نماز جنازہ میں لاکھوں افراد نے شرکت کی لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ پیر پگاڑا جو اُن کے اقتدار کے ابتدائی دنوں کے ساتھی تھے انہوں نے ضیاء سے سیاسی اختلاف کی بناء پر ان کی نماز جنازہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں شرکت نہ کی [۶۷]۔

جنرل ضیاء کی شخصیت میں بظاہر کوئی ایسی رنگینی اور دل آویزی نہیں تھی کہ لوگ ان کی جانب کھینچے چلے آتے بطور سیاست دان اور بطور عام انسان ان کی شخصیت میں نمایاں فرق تھا۔ وہ پاکستان کے پہلے حکمران تھے جنھوں نے لوگوں سے ملنے کا ایک خاص انداز اپنایا وہ ہر ایک سے بڑے انہماک سے ملتے، پہلی نظر پڑتے ہی ہاتھ ملاتے او گلے لگاتے دوسرے شخص کی بات بڑی دلچسپی اور توجہ سے سنتے ان کے اس دوستانہ رویے کی وجہ سے ان کے حلقہ احباب میں اضافہ ہوا اور انہوں نے متوسط طبقہ سے تعریف وتوصیف وصول کی لیکن ضیاء کو سیاسی تاریخ کے حوالے سے دیکھیں تو وہ ایسے سخت گیر حکمران محسوس ہوتے ہیں جو سیاسی اداروں کے وجود تک کے خلاف تھے انہوں نے ۱۹۷۳ء کے آئین کو اصلی شکل میں بحال نہ کیا اس میں ایسی تبدیلیاں کیں کہ ان کا ذاتی اقتدار بڑھ سکے۔ ان کے دور حکومت میں سیاسی اداروں اور حکومتی اداروں میں جنگ کی سی کیفیت رہی [۶۸]۔ جنرل ضیاء الحق کی شخصیت پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے دوستوں اور دشمنوں کو جان بوجھ کر اس بات کی اجازت دی کہ وہ انہیں Under Estimate کریں اور ایک کم تر درجہ کی شخصیت تصور کریں۔ ان کی اس حکمت عملی کے سبب ان کے اکثر دشمن و دوست ان کے اصل ارادوں سے بے خبر رہتے تھے اور بیشتر اوقات جنرل ضیاء کے بارے میں غلط اندازے لگاتے تھے۔

ضیاء دور میں کئی تضادات نظر آتے ہیں ایک طرف ان کے زمانے میں پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار صحافیوں کو کوڑے مارے گئے تو دوسری طرف پریس کو خاطر خواہ آزادی ملی۔ ایک طرف ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تو دوسری جانب بھٹو کو قتل کے مقدمے میں بری کرنے کا فیصلہ کرنے والے ایک جج کو سپریم کورٹ کا جج بنا دیا گیا۔ جنرل ضیاء نے ایک منظم پالیسی کے تحت بتدریج سول بیوروکریسی، عدلیہ اور سیاسی جماعتوں کو کمزور سے کمزور تر بنایا اپنے دورِ حکومت میں انہوں نے صرف فوج کے ادارے کو مضبوط کیا۔ جنرل ضیاء کسی بھی مسئلے کے حل کیلئے باقاعدہ منصوبہ بندی کرتے تھے پھر اس کے مطابق عمل کرتے ان کا اولین و آخر مقصد صرف اپنے اقتدار کو مستحکم کرنا تھا۔ ان کی پالیسی سے بعد کی حکومتوں کو کیا مسائل درپیش ہو سکتے ہیں اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ انہوں۔ نے جب بھٹو کو اقتدار سے علیحدہ کیا تو ان کے ذہن میں یہ واضح تھا کہ وہ بھٹو کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔ اگست ۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء ملتان میں افسروں کو خطاب کرنے کے لئے تشریف لائے جہاں ان سے پوچھا گیا کہ آپ بھٹو کے بارے میں کیا پالیسی اختیار کریں گے۔ ان کے قریب بریگیڈئیر میاں افضال اور بریگیڈئیر الیاس کھڑے تھے ان کو دیکھتے ہوئے کہا "میں افضال کو خود کیوں ماروں جب میں یہ کام الیاس سے کروا سکتا ہوں"۔ جولائی ۱۹۷۸ء میں جب جنرل ضیاء کو بتایا گیا کہ ہوسکتا ہے کہ بھٹو رہا کر دیئے جائیں اس پر انہوں نے کہا "اگر سپریم کورٹ بھٹو کو رہا بھی کر دے تو میں اسے ملٹری کورٹ سے پھانسی دلواؤں گا" [۶۹]۔

بھٹو نے ۱۹۷۶ء میں ضیاء الحق کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ ضیاء بھٹو کا اعتماد حاصل کرنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ضیاء نے بھٹو کے سامنے خود کو ہمیشہ ایک اطاعت گزار اور وفادار فوجی آفیسر جو کہ سیاسی معاملات سے نا واقف ہے کے روپ میں پیش کیا جس کی وجہ سے بھٹو نے ضیاء الحق کو آٹھ سینئر جنرلوں کی موجودگی میں چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے کے لئے منتخب کیا۔ ضیاء خود کسی پر اعتماد نہیں کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ جب وہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر رہے انہوں نے اپنا کوئی نائب مقرر نہیں کیا کہ کہیں وہ ضیاء کو اقتدار سے علیحدہ نہ کر دے۔ ۱۹۸۸ء میں جب انہوں نے آسمبلی کو برطرف کیا تو مرکزی معاملات پر کنٹرول رکھنے کے لئے انتخابات تک کسی کو وزیر اعظم مقرر نہیں کیا حالانکہ صوبوں میں وزرائے اعلیٰ موجود تھے۔ جنرل ضیاء غیر ملکی سربراہوں سے تنہائی میں ملاقات کرنے کے عادی تھے اس لئے ملکی اور غیر ملکی عمائدین سے ان کی ملاقاتوں کی تفصیلات کسی تیسرے فرد کے علم میں نہیں ہوتی تھیں [۷]۔

جنرل محمد ضیاء الحق ایک ایسی شخصیت کے مالک تھے جس پر پراسراریت کی کئی تہیں چڑھی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ اگلے لمحے کیا قدم اُٹھانے والے ہیں گیارہ سال ایک ماہ اور تیرہ دن برسر اقتدار رہنے کے دوران ان کی شخصیت کسی پر مکمل طور پر کھل نہ سکی وہ کچھ کر گزرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور مشکل سے مشکل فیصلے بڑی آسانی سے کر لیتے تھے۔ وہ بڑے سے بڑے طوفان خیز مرحلوں پر نہ صرف اپنے حواس قائم رکھتے تھے بلکہ اپنے جذبات بھی قابو میں رکھتے تھے۔ وہ اپنے مخالفین کی تمام چالوں پر نظر رکھتے تھے وہ کھیل ہی کھیل میں انہیں اس مقام پر لے جاتے کہ وہ اپنی تمام چالیں ان پر ظاہر کر دیں۔ اس مرحلے پر وہ کسی جوش و جذبہ کا مظاہرہ کئے بغیر موقع کی طاق میں رہتے اور جب انہیں موقع میسر آتا وہ ایک ہی چال چل کر پوری بساط الٹ دیتے اور مخالفین منہ دیکھتے رہ جاتے [۸]۔

تجزیہ بحث

جنرل ضیاء کا دور عالمی اور قومی سطح پر بہت اہم مگر متنازعہ حیثیت رکھتا ہے۔ ضیاء الحق نے خود کو اسلام کا چمپئن اور ایک عوامی شخصیت کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی اُنہیں عالم اسلام کی مرکزی قیادت میں اہمیت حاصل رہی لیکن مجموعی طور پر اُن کا دور آج کے سیاسی تناظر میں اُن کے دورِ حکومت کے امیج سے مختلف نظر آجاتا ہے۔ ضیاء الحق اپنے دورِ حکومت میں اقتدار کے جواز، بقاء، اپنے اقتدار کے لئے چیلنج بننے، عوامل سے نپٹنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ضیاء الحق نے مارشل لاء بذات خود ایسے وقت لگایا جب اس کی ضرورت نہیں تھی اور اُس کے بعد ضیاء الحق احتساب، اسلامائزیشن، سیاست میں اعلیٰ قدروں کے فروغ اور انتخابات میں مثبت نتائج کے حوالے سے اپنے اقتدار کو طول دینے کا جواز بناتے نظر آتے ہیں۔ یک طرفہ احتساب اسلامائزیشن کی فرقہ وارانہ بنیاد، مذہبی لسانی جماعتوں کا فروغ ایسے عوامل تھے جن کے ذریعے مخالف سیاسی راہنماؤں اور جماعتوں کو منظر سے ہٹانا اور اپنے اقتدار کو مستحکم کرنا مقصود تھا۔ افغان مسئلہ کے حوالے سے جو خارجہ پالیسی بنائی گئی اُس نے زوال روس کے بعد مسلم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دُنیا کو بے آسرا کر دیا ہے اور واحد سپر پاور نے کمیونزم کے بعد اسلام کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے جہاد، دہشت گردی سمجھ لیا گیا ہے۔اس طرح امریکہ کی پالیسی کے تحت ضیاءالحق اپنے اقتدار کی ضمانت حاصل کرتے رہے۔

بین الاقوامی حالات میں تبدیلی کے باوجود ضیاءالحق جمہوریت اور اپنی حکومت کے لئے کوئی پابندی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔فوج اور بیوروکریسی اُن کے ہتھیار تھے۔لہٰذا جونیجو کی سربراہی میں جیسی جمہوریت بحال کی گئی اُس کے ساتھ بھی ضیاءالحق کا شخصی اقتدار کا ٹکراؤ واضح نظر آتا ہے۔وہ حکومتی امور کو اپنی مرضی سے چلانا چاہتے تھے جبکہ جونیجو تمام اداروں پر سیاسی حکومت کنٹرول کے خواہاں تھے اس پس منظر میں ضیاءالحق اپنے متعلق رائے سے بہت مختلف قسم کی شخصیت نظر آتے ہیں جو سیاسی عزائم کی تکمیل کے لئے ہر طرح کے جواز اور حکمت عملی کو جائز تصور کرتے تھے۔

غیر ملکی علماء نے ضیاء کے دور میں تو روس کے خلاف ان کی پالیسی کی وجہ سے انہیں سراہا لیکن بعد کے حالات میں خصوصاً افغانستان میں طالبان کے عروج میں پاکستان کے کردار کے حوالے سے ضیاء حکومت کا حوالہ بدل گیا ہے۔

یقینی طور پر ضیاءالحق کی وفات کے اٹھارہ سال بعد ان کے فیصلوں اور اقدامات کی عملی حیثیت سامنے آ چکی ہے جو ضیاءالحق کے دورِ حکومت اور اُن کے اقدامات کے حوالے سے کوئی زیادہ خوش کن تاثر پیش نہیں کرتی۔عمومی طور پر ضیاءالحق اپنے پورے دورِ حکومت میں مختلف اقدامات کے ذریعے یا تو اپنی حکومت کا جواز ڈھونڈنے یا اپنی حکومت کو طول دینے کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں۔اس کوشش سے نکل کر وہ اپنی حکومت کو استحکام دینے اور خطرات کم کرنے کی جدوجہد میں مصروف رہے۔مجموعی طور پر اُن کا دور جواز اور بقاء حکومت کی خواہش کے حصار میں نظر آتا ہے اور سماجی و معاشی، فوجی و بین الاقوامی حالات اس خواہش کے حصول میں معاون رہے۔

حوالہ جات

۱۔ روئیداد خان، پاکستان انقلاب کے دہانے پر، مترجم عرفان احمد امتیازی، کراچی، ۲۰۰۱ء۔

۲۔ Altaf Gauhar, *Third World Affairs 1985*, London, 1985.

۳۔ K.M. Arif, *Working with Zia Pakistan's Power Politics 1977-1988*, London1995.

۴۔ Muhammad Waseem, *Politics and the State in Pakistan Lahore*, 1989, p. 365.

۵۔ Dr. Manzooruddin Ahmed (ed.), *Contemporary Pakistan: Politics, Economy and Society*, Karachi, 1980, p. 25.

۶۔ منیر احمد، پاکستان کے سیاسی اتحاد، لاہور، ۱۹۹۳ء ص ۸۱۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۷۔ Shahid Javed & Craig Baxter, *Pakistan under the Military: Eleven Years of Zia-ul-Haq*, America, 1991, p. 29.

۸۔ پروفیسر غفور احمد، پھر مارشل لاء آگیا، ۱۹۸۸ء، ص ص ۱۱۷۔۱۱۸۔

۹۔ کوثر نیازی، اور لائن کٹ گئی، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ص ۱۴۴۔۱۴۶۔

۱۰۔ Gen. K. M. Arif, op.cit., p. 93.

۱۱۔ Veena Kukreja, *Military Intervention in Politics: A Case Study of Pakistan*, New Delhi, 1985, p. 35.

۱۲۔ Muhammad Waseem, *Pakistan Under Martial Law, 1977-1985*, Lahore, 1987, pp. 2-3.

۱۳۔ Dawn, 6 July 1977.

۱۴۔ Ibid.

۱۵۔ لارنس زیرنگ، مترجم: یوسف اعوان، پاکستان کا سیاسی بحران، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۲۶۳۔

۱۶۔ Rafi Raza (ed.), *Pakistan in the Perspactive 1947-97*, Karachi, 1997, pp. 34-35.

۱۷۔ لارنس زیرنگ، مترجم: یوسف اعوان، بحوالہ سابقہ، ص ص ۲۵۷۔۲۶۵۔

۱۸۔ Maj. Gen. Rahat Latif, Plus Bhutto's Episode, Lahore,1993 pp.191-192.

۱۹۔ Ibid., p.374.

۲۰۔ Hasan Askari Rizvi, *The Military & Politics in Pakistan 1947-86*, Lahore, 1996, p.235.

۲۱۔ روزنامہ نوائے وقت، ۶ جولائی ۱۹۷۷ء۔

۲۲۔ ایم۔ اے چوہدری، مارشل لاء کا سیاسی انداز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۰۔

۲۳۔ G. w. Choudhury, *Pakistan: Transition From Military to Civilian Rule*, England, 1988, p. 130.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۴۔ Afzal Iqbal, *Islamisation of Pakistan*, Lahore, 1986, p.12.

۲۵۔ Ibid.

۲۶۔ Hasan Askari Rizvi, op.cit., p.234.

۲۷۔ G.W. Choudhury, op.cit., p.146.

۲۸۔ Shahid Javed Burki & Criag Baxter, op.cit., p. 36.37.

۲۹۔ Ayesha Jalal, *The State of Martial Rule*, London,1991,pp.319-320.

۳۰۔ Hafeez Malik, *Soviat American Relations with Pakistan, Iran and Afghanistan*, Hangkong, 1987, pp. 130-131.

۳۱۔ Dawn, 28 January 1980.

۳۲۔ Frederic Grare, *Pakistan and the Afghanistan Conflict 1979-1985: with an Afterword Covering Events from, 1985-2001*, Karachi, 2003, p. 156-159.

۳۳۔ Mushahid Hussain, *Pakistan's Politics: The Zia Years*, Lahore, 1990, pp. 217-218.

۳۴۔ Shahid Javed Burki and Craig Baxter, op.cit., p. 18.

۳۵۔ روزنامہ جنگ، ۲۴ فروری ۱۹۷۸ء۔

۳۶۔ Pakistan Times, 17 August 1978.

۳۷۔ G. W. Choudhury, op.cit, p. 51.

۳۸۔ Lawrence Ziring, *Pakistan in the Twentieth Century: A Political History*, Karachi, 1997, p. 461.

۳۹۔ Gen. K.M. Arif, op.cit., p. 218.

۴۰۔ پروفیسر غفور احمد، بحوالہ سابقہ، ص ص ۱۳۱۔۱۳۲۔

۴۱۔ Craig Baxter, *Zia's Pakistan: Politics and Stability in a Frontline State*, Lahore, 1985, p. 38.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

Gen. K. M. Arif, op.cit., pp. 28. ۴۲۔

Muhammad Waseem, *Pakistan Under Martial Law, 1977-1985*, p.8. ۴۳۔

Afzal Iqbal, op.cit., pp. 125-126. ۴۴۔

روزنامہ نوائے وقت، ۱۳ جنوری ۱۹۸۵ء۔ ۴۵۔

Gen. K.M. Arif. op.cit., p.231. ۴۶۔

Afzal Iqbal, op. cit., p. 130. ۴۷۔

Criag Baxter, op.cit., p. 45. ۴۸۔

Afzal Iqbal, op.cit., pp. 131-132. ۴۹۔

Muhammad Waseem, *Politics and the State in Pakistan*, p. 142. ۵۰۔

Hamid Khan, *8th Amendment: Constitutional and Political Crises in Pakistan*, Lahore, 1995, p. 22. ۵۱۔

Dawn, 2 April 1997. ۵۲۔

Hasan Askari Rizvi, op.cit., p. 249. ۵۳۔

Muhammad Waseem, op.cit., p. 415. ۵۴۔

Syed Shabbir Hussain, *Ayub, Bhutto and Zia: How They Fell victim to their own plans*, Lahore, 2001, p. 275. ۵۵۔

G. W. choudhury, op.cit.,p. 180. ۵۶۔

Shahid Javed and Craig Baxter, op.cit., p. 71. ۵۷۔

Gen. K.M. Arif, op.cit., p. 239. ۵۸۔

Ibid., ۵۹۔

Mushahid Hussain, op.cit., p. 245. ۶۰۔

Syed Shabbir Hussain, op.cit., pp. 278-280. ۶۱۔

Safdar Mahmood, *Pakistan: Political Roots and Development*, ۶۲۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

1947-1999, Karachi, 2002, pp. 383-384.

۶۳۔ Ibid.,

۶۴۔ G. W. Choudhury, op.cit., p. 181.

۶۵۔ Lawrence Ziring, op.cit., pp. 500-502.

۶۶۔ Mushahid Hussain, op.cit., pp. 267-268.

۶۷۔ Dawn, 19 August 1988.

۶۸۔ فیض علی چشتی، بھٹو ضیاء اور میں، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۸۹۔

۶۹۔ Mushahid Hussain, op.cit., pp. 263-265, 268.

۷۰۔ فیض علی چشتی، بحوالہ سابقہ، ص ۹۰۔

۷۱۔ روزنامہ جنگ، ۱۹ اگست ۱۹۸۸ء۔

© rasailojaraid.com